ڈاکٹر علی محمد خان

پروفیسر آف اردو، ایف سی کالج یونی ورسٹی لاہور

مولانا محمد علی جوہر کی شاعری پر ایک نظر

Dr. Ali Muhammad Khan

Professor of Urdu, F C College University, Lahore

A Reveiw of Molana Muhammed Ali Johar's Poetry

Molana Muhammed Ali Johar was a multi dimensional dignitary. He had a prominent rank in movement of freedom. He was not only a political activist but a well-known poet also . In this article efforts are made to analyze his poetry.

مولانا محمد علی جوہر کی شخصیت بڑی ہمہ جہت اور ہمہ گیر تھی۔ وہ اپنے عہد کے اہم سیاسی رہنما تھے۔ انھوں نے تحریکِ آزادی کی جدوجہد میں مہاتما گاندھی کے شانہ بشانہ قائدانہ کردار ادا کیا اور مشترک قومیت کے تصور کا شدّ ومد کے ساتھ پرچار کیا۔ برِعظیم میں تحریکِ ترکِ موالات اور تحریکِ خلافت کے ابواب ان کے نام کے بغیر مکمل نہیں ہوتے۔ وہ انگریزی اور اردو کے بے باک صحافی اور اعلیٰ درجے کے انشا پرداز اور دونوں زبانوں میں شعلہ بیان مقرر کی حیثیت سے شہرتِ عام رکھتے تھے۔ بالعموم ان کی صحافتی اور سیاسی سرگرمیاں اتنی تیز وتند ہیں کہ ان کے مقابلے میں ان کی شاعری تقریباً ماند پڑتی نظر آتی ہے جب کہ حقیقت یہ ہے کہ وہ متذکرہ حیثیتوں کے علاوہ اردو کے ایک منفرد، قادرالکلام اور نابغۂ روزگار شاعر تھے اور انھوں نے اپنی نظموں بالخصوص غزلوں سے اردو شاعری کو ایک نئے لب ولہجہ اور ذائقے سے آشنا کیا۔

محمد علی شاعری کی طرف اوائل عمر ہی سے بالطبع میلان رکھتے تھے۔ ابتدا میں ان کے ذوقِ شعر کی تربیت ان کے بڑے بھائی ذوالفقار علی خاں نے کی، جو گوہر تخلص کرتے تھے اور استاد داغ دہلوی کی، جن کا قیام اس زمانے میں رام پور میں تھا، صحبتوں سے فیض یاب ہوتے تھے۔ محمد علی بھی اپنے بھائی کے ہم راہ استاد داغ کے ہاں جانے لگے۔ استاد داغ کی صحبت نے ان کے لیے سونے پر سہاگے کا کام کیا اور ان کی شاباشی سے ان کا حوصلہ بڑھا۔ مولانا محمد علی جوہر ایک جگہ مولانا عبدالماجد دریابادی کے ایک استفسار کے جواب میں اپنی شاعری کے آغاز ومحرکات بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''میں رام پور میں اس زمانے میں پیدا ہوا تھا جب گھر گھر مشاعرہ ہوتا تھا۔ داغ، امیر، تسلیم، عروج دہلی اور لکھنؤ کے آسمان کے ٹوٹے ہوئے ستارے سب رام پور کے آسمان سے نورافشانی کر رہے تھے۔ خود میرے خاندان میں بھی شعر گوئی کا ذوق ہوا۔ تین چار عزیز استاد داغ کے شاگرد ہوئے......ذوالفقار علی روزانہ داغ کے گھر جاتے تھے اور مجھے بھی لے جاتے تھے۔ داغ نے پہلے دن پوچھا کہ کہو کچھ شعر بھی یاد ہیں۔ میری عمر بہت کم تھی مگر بھائی نے کچھ شعر یاد کرا دیے تھے جنھیں میں نہایت شان اور زور سے کڑک کر پڑھتا تھا۔ میں نے داغ ہی کے چند شعر انھیں سنا

دیے، سن کر پھڑک گئے اوراس کے بعد ہمیشہ اصرار رہا کہ اس بچے کو ضرور لایا کرو۔اس کے بعد اگر میں یہ دعویٰ کروں کہ شعر وسخن کی گود میں پلا ہوں تو بے جا نہ ہوگا...... میں نے دس برس ہی کی عمر میں بہت لغو وفضول شعر مگر بامعنی اور موزوں کہے تھے اور اچھا ہوا کہ وہ اب کسی کو یاد نہیں ورنہ قیامت کے دن استاد داغ میرا دامن پکڑتے کہ خود بھی بدنام ہوئے اور ہمیں بھی بدنام کیا۔''

یہ وہ زمانہ ہے جب دہلی اور لکھنؤ کے زوال اور بربادی کے بعد اردو شعراء نے جن مراکز میں پناہ لی تھی، ان میں سے ایک رام پور تھا۔ چونکہ فرمانروایانِ ریاست بالعموم سخن فہم اور شعراء کے قدر دان تھے، اس لیے فطری طور پر رام پور کی فضا شعر وسخن کے فروغ کے لیے بڑی سازگار تھی۔ محمد علی نے اسی ماحول اور فضا میں آنکھ کھولی۔ انھیں شاعرانہ ذوق جو قدرت کی طرف سے ودیعت ہوا تھا، اس پر مستزاد ہوا۔ رام پور سے نکل کر جب وہ علی گڑھ پہنچے تو یہاں کی فضا میں ان کے ذوقِ شعر کو مزید نکھرنے اور بار آور ہونے کے مناسب مواقع حاصل ہوئے۔ انھیں علی گڑھ کی فضا میں سرسید احمد خاں کے علاوہ مولانا شبلی نعمانی اور سجاد حیدر یلدرم اور مولانا حسرت موہانی جیسے یگانۂ روزگار لوگوں کی صحبت میسر رہی۔ محمد علی کی اس زمانے کی شاعری تو اگرچہ قدیم وضع واقدار کی ویسی ہی شاعری ہے جیسے فارسی یا اردو کلاسیکی شاعری میں محبوب کے حسن و جمال اور غمزہ وعشوہ وادا کے چرچے ہیں اور بظاہر ان کی شاعری کی زبان بھی روایتی ہے اور اس میں لفظیات کے اعتبار سے بھی کوئی نئی بات نہیں مگر حقیقت یہ ہے کہ علی گڑھ ہی کی فضا میں ان کی شاعری کو پر پرواز نصیب ہوئے جہاں رسم وروایت کی پاسداری کے باوجود وہ اپنے جذبات و احساسات کو انفرادی رنگ میں پیش کرنے میں کامیاب رہے ہیں، جس میں شاعرانہ خلوص اور صداقت کا دخل ہے اور جس نے ان کی غزلوں کو نیا رنگ وآہنگ عطا کیا ہے اور جس میں معنی ومفہوم کی کچھ نئی جہتیں پیدا کی ہیں مگر ان کے اس دور کے کلام میں اس جدّت اور اُپج کی کارفرمائی نہیں ہے جس نے بعد میں ان کے کلام کو امتیازی حیثیت دی۔

علی گڑھ سے فارغ ہونے کے بعد محمد علی شاعری سے تقریباً بیگانہ رہے۔ آکسفورڈ کے عرصۂ قیام میں ان کی زیادہ تر توجہ اپنی پڑھائی اور زہد وتقویٰ کی طرف رہی۔ آکسفورڈ سے لوٹنے کے بعد وہ کچھ عرصہ گھر گرہستی کے بکھیڑوں اور ملازمت کے مسائل میں الجھے رہے اور انھیں شعر وشاعری کی طرف توجہ کرنے کا موقع نہ ملا۔ ملازمت سے سبک دوش ہوئے تو انھیں طبیعت اور وقت کے تقاضوں کے تحت اپنی توجہ صحافت پر مرکوز کرنا پڑی۔ اب ان کے پیشِ نگاہ ملک وملّت کے پیچیدہ مسائل تھے جن میں وہ دن رات الجھے اور ان پر خامہ فرسائی کرتے رہے۔ ایک طرف ان کے سامنے ملک کو انگریزوں کی غلامی سے نجات دلانے کا معاملہ تھا تو دوسری طرف قومی اور اس سے آگے بڑھ کر بین الاقوامی سطح پر مسلمانوں کے تہذیبی وجود اور ملّتِ اسلامیہ کے تحفظ و بقا کا مسئلہ درپیش تھا۔ یہ وہ دور ہے جب ہندوستان میں ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان سیاسی کشمکش بڑھتی جارہی تھی اور ملّتِ اسلامیہ کے اتحاد کو مغربی سامراجیت سے شدید خطرات لاحق تھے اور محمد علی جوہر کی زبان وقلم کا سارا زور انھی مسائل پر غور وخوض اور ان کے عواقب پر صرف ہورہا تھا اور انھیں شعر وسخن کی طرف توجہ دینے کی قطعاً فرصت نہ تھی۔ اس زمانے میں جب انھیں قید وبند کی سختیوں سے گزرنا پڑا تو البتہ انھوں نے دل کا بوجھ ہلکا کرنے کے لیے شاعری کا سہارا لیا۔ ان کا اس عرصے کا کلام پھر بھی اہمیت کا حامل ہے اور اس کا انداز بھی روایتی غزل سے مختلف ہے اور اس میں ابتذال کے بجائے ترفع، فرسودگی کے بجائے تازگی اور انجماد کے بجائے حرکت وعمل کے جذبات کا احساس ہوتا ہے۔ جوہر کی تمام تر سیاست اور صحافت کا مرکز قومیت اور ملّیت ہے اور اب ان کی شاعری کے محرکات بھی یہی ہیں جن میں بقول مولانا عبدالماجد دریابادی ''سیاست اور ایمانیات'' کی جھلک ہے، جو قال بن کر نہیں حال بن کر

ظاہر ہوئے ہیں۔ چنانچہ محمد علی جوہر کی شاعری کے پس منظر میں اس دور کے سیاسی اور قومی رجحانات، ترکِ موالات اور خلافت کی تحریکوں کے واضح اثرات موجود ہیں جن میں ان کا دینی جوش وجذبہ اساسی عنصر کے طور پر جابجا کارفرما نظر آتا ہے، جس کا انھیں خود بھی احساس ہے چنانچہ اپنی شاعری کے محرکات پر روشنی ڈالتے ہوئے ایک جگہ لکھتے ہیں:

''گزشتہ چند سالوں سے اگر کچھ ترشح شاعری کا ہوا ہے تو وہی قومی مرثیہ مگر زیادہ تر رسمی۔ البتہ دو تین برس میں عشقِ حقیقی رنگ لایا ہے اور تغزل کا زور ہے۔''

جوہر نے اپنے ایک بیان میں اپنی شاعری کو ''دست افشانی'' اور ''پاکوبی'' کے عمل سے تعبیر کیا ہے۔ ان کا یہ بیان اس بات کا غماز ہے کہ ایک تو انھیں شاعری کے ساتھ فطری لگاؤ تھا۔ دوسرے ان کا بہترین کلام ان کے زمانۂ اسیری کی یادگار ہے اور حقیقت بھی یہی ہے کہ ان کی شاعری اسی دور میں ابھری اور مقبول ہوئی۔ شاید اسی بنا پر کچھ لوگ ان کی شاعری کو حبسیات کے ذیل میں رکھتے ہیں اور انھیں منفرد لہجے کا شاعر قرار دیتے ہیں۔ مولانا سید سلیمان ندوی کے الفاظ میں: ''محمد علی کی شاعری کا جوہر قید خانے میں جا کر کُھلا''۔ مولانا جوہر کے ایّامِ اسیری کا کلام مختلف رسائل وجرائد بالخصوص ''معارف'' میں تواتر کے ساتھ چھپتا رہا۔ اس دوران میں ان کی خط کتابت مولانا عبدالماجد سے رہی۔ اپنے بعض خطوں میں وہ حالاتِ حاضرہ کے ساتھ ساتھ اپنا تازہ کلام بھی قلم بند کرتے تھے۔

اصولِ فطرت ہے کہ شاعر اپنے معاشرے سے کم یا زیادہ اثر ضرور لیتا ہے اور جو کچھ وہ اپنے گرد وپیش میں دیکھتا ہے، اسے اپنے مخصوص انداز اور اپنی زبان میں پیش کر دیتا ہے، مگر اردو شعر وادب کی تاریخ میں بہت کم شاعر یا ادیب ایسے ہوئے ہیں جن کا تمام شعری سرمایہ یا ادب ان کی ذات کا عکاس ہونے کے ساتھ ساتھ اپنے زمانے کی تاریخ بھی مرتب کرے۔ اس ضمن میں مرزا غالب کے احباب کے نام لکھے خطوں اور مولانا حسرت موہانی اور مولانا ظفر علی خاں کے کلام کے کچھ حصوں کو بطورِ خاص پیش کیا جا سکتا ہے مگر مولانا جوہر کا تمام تر کلام ان کی شخصیت کا آئینہ دار اور اپنے زمانے کی تصویر ہے۔ مولانا جوہر کے کلام کا، جو درحقیقت ان کی آپ بیتی ہے، تجزیہ کرتے ہوئے سید سلیمان ندوی لکھتے ہیں:

''جوہر کے مختصر مجموعے میں کوئی شعر ایسا نہیں جس کا مفہوم یا شانِ نزول یا جس کا سیاسی، وارداتی عقائدی یا واقعاتی ماخذ یا تلمیحاتی اور اشاراتی رنگ جوہر کی نثر یا ان کے سوانح حیات نے واضح نہ کر دیا ہو۔ ادبیات عالم میں کم ایسا ہوا ہوگا کہ کسی شاعر کے اشعار نہ صرف شاعر بلکہ پوری قوم اور ملّت کی آپ بیتی کا اس طرح مرقع بن گئے ہوں کہ ان سے اس دور کی تاریخ اور جنگِ آزادی کی روداد مرتب کی جا سکے اور طرّہ یہ کہ شعریت پر آنچ نہ آئے۔''

مولانا جوہر کے کلام کے مطالعے اور تفہیم کی کوشش کے لیے ان کی شاعری کے محرکات اور تخلیقی پس منظر کو کسی طور پر نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ دوسرے یہ کہ انھوں نے اردو کی شعری روایات سے انحراف نہیں کیا۔

جوہر نے نظمیں بھی کہیں اور غزلیں بھی۔ نظمیں کم، غزلیں زیادہ۔ نظموں کی تعداد محض دس اور غزلیں چھیاسٹھ ہیں۔ ہر چند تعداد کم ہونے کے باوجود ان کی نظمیں بھی خوب ہیں مگر غزلیں زیادہ تاثر خیز ہیں۔ انھوں نے شاعری کی ابتدا نظمیں لکھنے سے کی تھی لیکن پھر جب بھی وقت میسر آیا غالب رجحان غزل گوئی کی طرف رہا۔ ان صفحات میں ہم ان کی نظم نگاری اور غزل گوئی کا سرسری جائزہ پیش کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔

مولانا نے اپنی شاعری کا آغاز رام پور سے کیا تھا جہاں اس زمانے میں دہلی اور لکھنؤ دونوں دبستانوں کے اساتذۂ فن سکونت پذیر تھے اور شعر وسخن کا بازار گرم تھا چنانچہ جوہر کی شاعری پر ان روایتوں کے واضح اثرات دیکھے جا سکتے ہیں اور ان کے یہاں دہلویت کی بنیادی

خصوصیات: فطرت، سادگی، متانت اور داخلیت کے ساتھ ساتھ لکھنویت کی بنیادی خصوصیات: معاشرتی احساس، نزاکت و لطافت اور خارجیت دونوں روایتیں موجود ہیں اور اس امتزاج نے ان کی شاعری کو دل کش بنا دیا ہے۔ جوہر کا میلانِ طبع نظم کے بجائے غزل کی طرف تھا اس لیے ان کی نظموں میں بھی غزل کا لطف موجود ہے تاہم ان کی شاعرانہ خوبیوں کا اظہار ان کی نظموں میں نہیں بلکہ غزلوں میں ہوا ہے لیکن اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ جوہر کی شاعری بنیادی طور پر ان کی آپ بیتی ہے مگر ان کی شاعری کا مطالعہ کرتے وقت ان کی نظموں کو ہرگز نظر انداز نہیں کیا جا سکتا کیونکہ ان کی نظموں سے ان کی شخصیت اور اندازِ فکر کے کچھ گوشے ہمارے سامنے آئے ہیں۔

کلیاتِ جوہر کی پہلی نظم ''عرض داشت بہ خدمت سرسید احمد خاں مرحوم ومغفور'' ہے، جو انھوں نے سرسید کے انتقال کے نو سال بعد ۱۹۰۷ء میں سرسید کی برسی کے موقع پر کہی اور علی گڑھ اولڈ بوائز کے جلسے میں پڑھی تھی۔ یہ نظم بڑی پسند کی گئی۔ دیکھیے جوہر نے کس سرشاری اور جوش و وجد کے عالم میں سرسید کو خراجِ عقیدت پیش کیا ہے:

بیان کس طرح ہو اے سید احمد خاں کہ کیا تم ہو
ہمارے عاشقِ دل دادہ تم ہو، دل ربا تم ہو
خبر لو قوم کی کشتی کی، گو کشتی سے باہر ہو
ہوئے ساحل پہ بھی تو کیا، ہمارے ناخدا تم ہو
بتا دو صاف رستہ ہم کو تم قومی ترقی کا
کہ ہم گم کردہ رہ ہیں اور ہمارے رہ نما تم ہو

اگلی دو نظموں میں، جیسا کہ نظموں کے عنوانوں: ''استقبالِ رمضان'' اور ''وداعِ رمضان'' سے ظاہر ہے، مولانا نے ماہِ رمضان کے بارے میں اپنی روحانی کیفیات کا اظہار کیا ہے۔ ان دونوں نظموں کا ایک ایک شعر معنی خیز اور تاثر انگیز ہے۔ مولانا نے یہ دونوں نظمیں بیتول جیل میں لکھی تھیں جہاں انھیں قیدِ تنہائی میں رکھا گیا تھا مگر رمضان کے نزول نے شاعر کی تنہائی کو جلوت آشنا کیا تھا اور وہ اپنے اندر ایک نئی حرارت اور تازگی محسوس کرنے لگے تھے لیکن جب رمضان وداع ہونے لگا تو وہ اداس ہو گئے، چنانچہ رمضان سے مخاطب ہو کر کہتے ہیں:

قیدِ تنہائی کی رونق تجھ سے تھی
اے شریکِ بزمِ زنداں الوداع!
غنچہ ہائے دلِ شگفتہ تجھ سے تھے
اے بہارِ باغِ ایماں الوداع!

ایک اور نظم بہ عنوان ''ہائے غلام حسین!'' ایک شخصی نوحہ کی حیثیت سے خاصی پر اثر ہے۔ دو اور نظمیں ''شانِ کلکتہ'' اور ''فغانِ دہلی'' کے عنوانوں کے تحت لکھی ہیں۔ جو قومی سطح کے سانحات کی آئینہ دار ہیں۔ مولانا نے یہ دونوں نظمیں چھنڈواڑہ جیل میں لکھی تھیں۔ یہ وہ زمانہ ہے جب پورا ملک رولٹ ایکٹ کے خلاف سراپا احتجاج تھا اور ۳۰/مارچ ۱۹۱۹ء کے ہنگاموں نے خاص طور پر امرتسر اور دہلی پر لرزہ طاری کر دیا تھا۔ ان دونوں جگہوں پر انگریزی حکومت نے طاقت کے زعم میں لوگوں پر ایسے ایسے ستم ڈھائے جن کے گواہ برعظیم کی تاریخ کے خونچکاں اوراق ہیں۔ ان ہنگاموں سے مولانا جوہر فطری طور پر شدید متاثر ہوئے، چنانچہ اپنی دلی کیفیات کا اظہار کرتے ہوئے کہتے ہیں:

کلمۂ حق ہے اگر وردِ زبانِ دہلی
مٹ سکے گا نہ کبھی نام و نشانِ دہلی
لب پہ آئے نہ کبھی شکوۂ جورِ اغیار
ہو زمانے سے الگ طرزِ فغانِ دہلی

دواور نظمیں ''نوحہ'' اور ''زائرِ مدینہ'' ہیں جو شاعر کے ملّی جذبات کی عکاسی کرتی ہیں۔ جوہر کی تمام نظموں میں سب سے پر تاثر نظم ''دعائے اسیر'' ہے جو شاعر نے اپنی منجھلی بیٹی آمنہ کی علالت کی خبر سن کر اس وقت لکھی تھی جب وہ ۱۹۲۳ء میں بیجاپور جیل میں قید تھے۔ پندرہ شعروں پر مشتمل تمام نظم سوز و گداز میں ڈوبی ہوئی ہے اور کوئی بھی صاحبِ اولاد شخص اس نظم کو بے چشمِ نم پڑھ نہیں سکتا، چند شعر ملاحظہ کیجیے:

میں ہوں مجبور پر اللہ تو مجبور نہیں
تجھ سے میں دور سہی وہ تو مگر دُور نہیں
ہم کو تقدیرِ الٰہی سے نہ شکوہ نہ گلہ
اہلِ تسلیم و رضا کا تو یہ دستور نہیں
تیری قدرت سے خدایا، تیری رحمت نہیں کم
آمنہ بھی جو شفا پائے تو کچھ دور نہیں
میری اولادکو بھی مجھ سے ملا دے یارب
تو ہی کہہ دے تیری رحمت کا یہ دستور نہیں

اس میں کوئی شبہ نہیں کہ سوائے ''دعائے اسیر'' کے جوہر کی نظموں کو ہیئتی، موضوعاتی اور رفعتِ تخیل کے اعتبار سے اعلیٰ درجے کی نظموں میں شمار نہیں کیا جا سکتا مگر یہ نظمیں شاعر کے جذبات کی عکاس ضرور ہیں۔

درحقیقت مولانا جوہر غزل کے شاعر تھے شاید یہی وجہ ہے کہ ان کی دس کی دس نظمیں بھی غزل کی ہیئت میں لکھی گئی ہیں اور جوہر کی شاعری کے جوہر بھی غزل میں کھلتے ہیں۔ پروفیسر گوپی چند نارنگ نے مولانا جوہر کی شاعری کا تجزیہ کرتے ہوئے بجا طور پر لکھا ہے کہ جوہر کو موضوع بندی اور برہنہ گفتاری سے کوئی علاقہ نہیں تھا یہی وجہ ہے کہ انھوں نے اپنے جذبات کے اظہار کے لیے وہی رمزی وایمائی پیرایۂ بیان اختیار کیا جو غزل کا خاصہ ہے اور ان کے شاعرانہ مزاج سے بھی ہم آہنگ نظر آتا ہے۔ جوہر کی شاعری کے دو اساسی محرک رہے ہیں: ایک ان کا ملّی جوش و جذبہ اور دوسرے ان کا راسخ مذہبی عقیدہ اور یہی دونوں محرک شاعری سمیت ان کی تمام سرگرمیوں کا محور ہیں جس میں وہ کسی تکلف یا تصنع کو روا نہیں رکھتے بلکہ ''از دل خیزد و بر دل ریزد'' کے مصداق ان کی شاعری ان کے اندرونی جوش اور جذبے کا اظہار ہے جیسا کہ وہ خود ایک جگہ لکھتے ہیں کہ ان کے اشعار ان کی ''دست افشانی اور پاکوبی'' کے لیے ہیں۔ عین ممکن ہے کہ یہ جملہ انھوں نے عجز و انکسار کے لہجے میں لکھا ہو لیکن یہ ضرور ہے کہ ان کی شاعری ان کی نظر میں بھی ان کے جذبات و احساسات کا بے محابا اظہار ہے۔ ہمارے اس خیال کی تائید مولانا عبدالماجد دریابادی کی اس رائے سے بھی ہوتی ہے جو وہ کلامِ جوہر کا تجزیہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''تکلّف اور تصنّع سے محمد علی کی زندگی کا ہر شعبہ پاک تھا۔ وہی رنگ یہاں بھی ہے۔ شعر کہتے ہیں، یہ معلوم ہوتا ہے

بے تکلف باتیں کرتے چلے جاتے ہیں۔ نہ کسی قسم کی تیاری، نہ کوئی اہتمام، کیسی نظرِ ثانی اور کہاں کا غور وفکر، نہ اصلاح نہ ترمیم، بس جو دل میں آیا جھٹ کہہ گزرے۔''

جھٹ سے شعر کہہ گزرنے کے ساتھ ساتھ جوہر کے کلام کی اور ایک اور نمایاں خوبی یہ ہے کہ ان کی غزلوں میں وہ گداز، نکھار اور بالیدگی موجود ہے جو ان کے فطری ذوقِ سخن کی آئینہ دار ہے۔ دراصل جوہر کی شاعرانہ تربیت جیسا کہ ہم اوپر بیان کر چکے ہیں رام پور کے اس ادبی ماحول میں ہوئی تھی جہاں ہر طرف شعر وشاعری کا غلغلہ تھا اور داغ وامیر وجلال جیسے استادانِ فن دادِ سخن دے رہے تھے۔ جوہر کے اس زمانے کے کلام سے جب وہ رام پور کے بعد علی گڑھ میں زیرِ تعلیم تھے، معلوم ہوتا ہے کہ وہ اس زمانے ہی میں زبان وفن کی باریکیوں سے آشنا تھے اور بڑے ہنر اور سلیقے سے شعر کہتے تھے۔ ہر چند جوہر کے ابتدائی کلام کے مضامین میں کوئی اچھوتا پن نہیں ہے اور وہ غزل کے وہی روایتی مضامین بیان کرتے ہیں جو اردو غزل کا خاصہ ہے تاہم ان میں بندش کی چستی اور حسنِ بیان کی قدرت موجود ہے۔ یہ چند شعر ملاحظہ کیجیے:

جنوں باقی ہے اب تک تو تری محفل میں بیٹھا ہے
کہ رہ رہ کر خیال آتا ہے جوہر کو بیاباں کا

....

یہ ستانے کی نکالی ہے انوکھی ترکیب
ظلم کا نام ستم گرنے حیا رکھا ہے

....

یقین آنے کو تو آجائے تیرے عہد و پیماں کا
تری آنکھ اے بُتِ وعدہ شکن کچھ اور کہتی ہے

جوہر کی نوعمری کی غزلوں ہی میں ان کے شاعرانہ مزاج کے وہ عناصر بخوبی نظر آجاتے ہیں جو بعد میں ان کی پختہ عمری کی غزل میں پوری توانائی کے ساتھ جلوہ گر ہوئے۔ جوہر کی طبیعت میں لڑکپن اور زمانۂ تعلیم ہی سے سیمابیت، جوش اور بانکپن کے عناصر موجود تھے جن میں حالات وواقعات اور وقت گزرنے کے ساتھ شدت آتی گئی اور ان عناصر نے ان کی غزل کو وہ لحن اور وہ لذّت عطا کر دی جس کی مثال اردو شاعری میں شاید کہیں اور نہیں ملتی۔

جیسا کہ ہم پہلے بیان کر چکے ہیں جوہر کی زندگی حق گوئی و بے باکی کی عمدہ مثال تھی۔ انھوں نے اپنا روپیا پیسا برباد کیا، عذاب جھیلے، قید وبند کی صعوبتیں برداشت کیں لیکن پریشان ہو کر یا کسی مصلحت کے تحت کبھی حالات سے سمجھوتا نہ کیا اور ہمیشہ زبان وقلم کے جہاد کے جذبے سے سرشار رہ کر ظلم اور ناانصافی کے خلاف نبرد آزما رہے اور تادمِ آخر ان کے پائے استقامت میں کبھی لرزش آئی اور نہ اس سلسلے میں انھوں نے کبھی تھکاوٹ ہی محسوس کی۔ ہمارے اس خیال کی تائید پروفیسر رشید احمد صدیقی بھی کرتے ہیں جو مولانا جوہر کی تحریر کے بڑے مداح ہیں اور جنھوں نے مولانا کو علی گڑھ میں کئی بار تقریر کرتے بھی سنا تھا۔ وہ لکھتے ہیں:

''کس بلا کے بولنے اور لکھنے والے تھے۔ بولتے تو معلوم ہوتا ابوالہول کی آواز اہرامِ مصر سے ٹکرا رہی ہے۔ لکھتے تو معلوم ہوتا کرپ کے کارخانے میں توپیں چل رہی ہیں یا پھر شاہجہاں کے ذہن میں تاج کا نقشہ مرتّب ہو رہا ہے!

میں نے ان کو اسٹیج پر آتے اور بولتے ہوئے سنا ہے اور خود محمد علی کو داد دینے سے پہلے انیس کو داد دی ہے:

ضیغم ڈکارتا ہوا نکلا کچھار سے

اسٹیج پر محمد علی جس طرح جھومتے بل کھاتے پہنچتے، جس کڑک، تڑپ غرّ یُو اور غلبہ سے بولتے، وہ میں نے دیکھا ہے، وہ بولنے میں تلوار اور گرز دونوں سے کام لیتے، وہ دنیا کے ہر حربے کا جواب اپنی تقریر سے دے سکتے تھے۔''

یہ ایک ناقابلِ تردید حقیقت ہے کہ برِعظیم کی جنگ آزادی کی تاریخ میں محمد علی جوہر کے علاوہ ایسی نادرو یکتا شخصیت کوئی اور نہیں ملتی جس نے اپنی سخت کوشی اور شعلہ نوائی سے تحریکِ آزادی کا نیا باب رقم کیا ہو۔ یہ انھی کا کام تھا کہ وہ بڑی بے خوفی اور دلیری کے ساتھ اپنے وقت کی جابر و قاہر حکومت کو للکارتے رہے اور زندگی بھر خانماں خراب رہنا قبول کر لیا لیکن حق گوئی کے مسلک پر ڈٹے رہے۔

جوہر کی شاعری بھی اسی مسلکِ حق گوئی کی تفسیر ہے جس کی لے وقت کی لہروں کے ساتھ ساتھ تند و تیز ہوتی چلی گئی۔ شمس الرحمٰن فاروقی کے خیال میں ''ان کی شاعری حرکت اور بے چینی اور پرشور استعاروں اور پیکروں سے بھری ہوئی ہے۔'' راقم الحروف کے خیال میں بھی یہی بات ہے مگر ان کی شاعری کے پس منظر میں ان کا راسخ مذہبی اعتقاد اور ایمان ہے اور اسی لیے ان کی شاعری میں اسلامی افکار و اقدار اور روایات کے گہرے نقوش نمایاں ہیں۔ دراصل جوہر نے ایاّم اسیری کے دوران میں قرآن مجید کا گہرا مطالعہ کیا تھا اور قرآنی تعلیم ان کی روح میں اس طرح رچ بس گئی تھی کہ جیل سے رہائی پانے کے بعد ان کی ساری سرگرمیاں بھی اسی رنگ میں رنگی گئیں۔ مولانا جوہر سیاست کو دین سے الگ نہیں سمجھتے تھے یہی وجہ ہے کہ ان کی شاعری سیاست اور مذہب کا امتزاج ہے، اس لیے بجا طور پر کہا جا سکتا ہے کہ جوہر کی غزلوں کا خارجی محرک سیاست ہے جب کہ داخلی محرک مذہب ہے۔ اسی سبب سے ان کی غزلوں میں جوش و ولولہ کے ساتھ ساتھ فنی حسن اور اثر نمایاں ہے جو ان کے شعری اظہار کو دیرپا اور دل کش بناتا ہے۔

مولانا جوہر نے کم و بیش ساڑھے چھے سال کا عرصہ مختلف جیلوں میں نظر بندی اور قیدِ تنہائی میں بسر کیا جہاں ان پر طرح طرح کی پابندیاں تھیں: ان کے خط سنسر ہوتے تھے اور جہاں سے ان کا کلام جیلر کے دستخطوں اور مہر کے بغیر جیل سے باہر نہیں آ سکتا تھا۔ مگر اس عرصے میں بھی وہ حالات سے ایک لمحے کے لیے مایوس نہیں ہوئے کیونکہ انھیں اپنے خدا کی ذات پر پورا بھروسا تھا کہ انھیں دنیا کی کوئی طاقت نقصان نہیں پہنچا سکتی اور اگرچہ وہ پابندِ سلاسل ہیں لیکن ایک دن ایسا ضرور آئے گا کہ وہ اپنی منزل پر پہنچیں گے۔ یہی وجہ ہے کہ زنداں کی قیدِ تنہائی کو شاداں و فرحاں کاٹ رہے ہیں جیسا کہ کہتے ہیں:

سُرورِ کیفِ لَاتَــــحُ کو بشرے سے عیاں پایا ــــزَنُ

اسیرِ قیدِ تنہائی کو مست و شاداں پایا

اور قید و بند کی حالت میں اپنے آپ کو خوش و خرم پاتے ہیں تو باری تعالیٰ سے صبر و استقامت کے ساتھ ظلم اور ناانصافی کے خلاف حق و صداقت کا علم بلند رکھنے کی دعا کرتے ہیں کیونکہ وہ سمجھتے ہیں کہ اگرچہ ان کے پاس دنیاوی دولت اور طاقت کچھ نہیں مگر تائیدِ ایزدی سے وہ سُرخ رو ہو سکتے ہیں اور انھیں اپنے خدا کی ذات پر کامل یقین ہے کہ وہ اپنے اس عاجز بندے کی جو دن رات اسی کی بارگار سے نصرت کا خواستگار رہے، مدد ضرور فرمائے گا۔ چنانچہ وہ کہتے ہیں:

قیدِ تنہائی کا لذّت آشنا

کیسے کہہ دوں تارکِ لذّات ہے
دل سے ہوتی رہتی ہیں سرگوشیاں
اب یہی اِک مشغلہ دن رات ہے

اور یہ دو شعر بھی ملاحظہ کیجیے جو اسی کیفیت کا پتا دیتے ہیں:

پہنچ جائیں گے منزل تک بھی اک دن
چلے تو ہیں بھروسے پر خدا کے
اسیری میں بھی جاری ہے دن رات
بس اب تو رہ گئے ہیں ہم دعا کے

بلکہ قید تنہائی میں انھیں یک گونہ تسکینِ قلب اور تسکینِ قلب سے بڑھ کر طمانیت حاصل تھی مثلاً یہ شعر دیکھیے:

تسکین دہِ اسیرِ قفس تھا خیالِ گل
دو چار دن میں آپ طبیعت ٹھہر گئی

....

ہوں بے ہراس یہ مجھے رکھیں کسی جگہ
ڈر ہو وہاں کہ تیری حکومت جہاں نہ ہو

مولانا کے درج ذیل شعر بھی اسی زمانے کی یادگار ہیں جب مولانا کی خط کتابت پر قدغن تھی مگر انھیں اطمینانِ قلب حاصل تھا:

ملتی نہیں کسی کو سند امتحاں بغیر
دار و رسن کے حکم کو سمجھو صلائے دوست

....

آزاد تھے کب قیدِ غمِ عشق سے، ہم کو
زنجیر کا شکوہ ہے، نہ زنداں کی شکایت

اور باری تعالیٰ کے اس بطلِ جلیل نے اپنی بے سروسامانی اور بے بضاعتی کے باوجود محض اپنے جذبۂ حریّت اور حوصلے کے ساتھ وہ کچھ کر دکھایا جو ہندوستان کے لوگوں کے تصور میں بھی نہیں آ سکتا تھا۔ اسی بنا پر انھیں ''رئیس الاحرار'' کے لقب سے مُلقب کیا گیا اور ان کا نام برِعظیم کی تحریکِ آزادی کے فرزندوں کی فہرست میں جلی حروف میں لکھا گیا۔

مولانا جو ہر ایک طرف ہندوستان کو برطانوی تسلّط سے آزاد دیکھنے کے شدید متمنی تھے تو دوسری طرف وہ عالمِ اسلام کو مغربی استعماری قوتوں کی گرفت سے آزاد کرانا ضروری سمجھتے تھے، مگر جب جنگِ عظیمِ اوّل (۱۹۱۴ء۔۱۹۱۹ء) کے اختتام پر اتحادی قوتوں کا پلّہ بھاری رہا تو انھوں نے مفتوحہ ممالک میں اکھاڑ پچھاڑ اور بندر بانٹ شروع کر دی جس کا سب سے بڑا ہدف عالمِ اسلام تھا۔ مولانا جوہر کو عالمِ اسلام کے مستقبل کی طرف سے بڑی تشویش تھی اور وہ خلافتِ عثمانیہ کی، جسے عالمِ اسلام کے مرکز کی حیثیت حاصل تھی، تباہی کسی طور برداشت نہیں کر

سکتے تھے، اسی زمانے میں جب وہ بیجاپور ڈسٹرکٹ جیل میں قید تھے، ترکوں اور یونانیوں کے مابین سمرنا کا معرکہ جاری تھا، جس کے لیے ترکوں نے سردھڑ کی بازی لگا رکھی تھی۔ مولانا دن رات خدا تعالیٰ سے ترکوں کی فتح کے لیے دعا کرتے رہتے تھے۔ ایک دن مولانا کو اپنی کال کوٹھڑی میں نعرۂ تکبیر کی صدائیں سنائی دیں تو مولانا نے نعرے لگانے والوں کے جوش و خروش سے قیاس کیا کہ باری تعالیٰ نے ترکوں کو فتح سے ہم کنار کیا ہے تو یہ شعر ان کی زبان پر جاری ہوگیا:

آئی نہ ہو زنداں میں خبر موسمِ گُل کی
سننا تو ذرا شورِ عنادل تو نہیں یہ

اور اسی وفورِ شوق کے عالم میں دو برجستہ غزلیں کہہ ڈالیں۔ ایک غزل کے یہ چند شعر دیکھیے اور مولانا کے ملک و ملّت کے ساتھ جوش و جذبہ کی داد دیجیے:

عالم میں آج دھوم ہے فتحِ مبین کی
سُن لی خدا نے قیدیِ گوشہ نشین کی
تیرے کرم نے اور بھی گستاخ کر دیا
اک عرض اور ہے ابھی اس کم ترین کی
اک گھر ترا یہاں بھی تو ہے اُس کے باب میں
کب لامکاں سے ہوگی مشیّت مکین کی
ہیں سب عرب میں شام، فلسطین اور عراق
ہے شرط جس کے واسطے صرف ایک دین کی

اور اسی عالمِ جذب و مستی میں کہی ہوئی دوسری غزل کے یہ شعر بھی ملاحظہ کیجیے:

آخر کو لے کے عرش سے فتح و ظفر گئی!
مظلوم کی دعا بھی کبھی بے اثر گئی!
عالم کا رنگ اور سے کچھ اور ہوگیا
ہم بے کسوں کی آہ عجب کام کر گئی
اے دورِ چرخ ! کب سے ہیں مے خوار تشنہ لب
سن تو سہی وہ گردشِ ساغر کدھر گئی

محکوم و مجبور ہندوستان پر انگریزوں کا تسلّط اور عالم اسلام پر مغربی استعمار کی چیرہ دستیاں مولانا جوہر کی بالعموم شاعری کا محور ہے اور جوہر کی غزلوں کا بیشتر حصہ بھی اسی حوالے سے رمز و ایما، تمثیلوں اور استعاروں کے دل نشین پیرائے میں بیان ہوا ہے اور اس زمانے میں لکھا گیا ہے جو کم و بیش ۱۹۱۴ء سے شروع ہو کر ۱۹۲۲ء تک جاتا ہے، جو ان کی نظر بندی اور قید و بند کا زمانہ ہے۔ اس زمانے میں مولانا جوہر کو ایک ہی دُھن تھی کہ ملک کو انگریزوں کی غلامی سے نجات ملے۔ اس عرصے میں انھوں نے جو کچھ لکھا اس کے پس منظر میں آزادیِ وطن کا جذبہ کارفرما نظر آتا

ہے، اس لیے ان کی غزلیں روایتی غزلوں سے یکسر ممتاز نظر آتی ہیں۔ مثلاً انھوں نے درج ذیل تراکیب کو فارسی اور اردو کی روایتی علامتوں اور استعاروں سے ہٹ کر اپنی معنوی فضا میں نئے مفاہیم کے طور پر برتا ہے:

گردشِ دوراں، جورِ گل چیں، اہلِ عشق، ملزمِ عشق، جرمِ عشق، دلِ مضطر، چشمِ گریاں، بلبلِ نالاں، منقارِ عندلیب، بوئے گل، یادِ گل، شورِ سلاسل، قیدِ قفس، متاعِ قفس، قیدِ حیات، اربابِ وفا، قیدِ وفا، قیدِ فرنگ، قیدِ تنہائی، شبِ ہجراں، فصلِ خزاں، جورِ خزاں، بہارِ بے خزاں، شوقِ شہادت، مستحقِ امتحان، سندِ امتحاں، زندانِ الفت، سوئے زنداں، رقصِ بسمل، دستِ وحشت، دستِ جنوں، جوشِ جنوں، جنونِ عشق، جنونِ نارسا، مجرمِ اقراری، رسمِ وفاداری، دارورسن، مستحقِ دار، پیامِ مرگ، داروئے شفا، خوگرِ جور، کشورِ کفر، ترکشِ کفر اور مژدۂ وصل۔ اگر غزلیاتِ جوہر کا بنظرِ غائر مطالعہ کیا جائے تو اس طرح کی مزید تراکیب آسانی سے مل سکتی ہیں۔ ہمارے اس دعوے کی تائید میں غزلیاتِ جوہر میں سے چند تراکیب کے حامل شعر پیش کیے جاتے ہیں جن کی معنوی فضا روایت سے مختلف ہے۔ مثلاً یہ اشعار ملاحظہ کیجیے:

جورِ گل چیں یاد رکھ، قیدِ قفس کا غم نہ کر
چین کب، اے بلبلِ نالاں تجھے گلشن میں تھا

....

سب ہیں فانی، غمِ دنیا نہ رہا، ہم نہ رہے
رہ گیا نامِ غمِ عشق کی غم خواری کا

....

گر بوئے گل نہیں نہ سہی یادِ گل تو ہے
صیّاد لاکھ رکھے قفس کو چمن سے دُور

....

گر ہے تجھے متاعِ قفس اس قدر عزیز
صیاد خود ہیں تیری نگہبانیوں میں ہم

....

ہے سنّتِ اربابِ وفا صبر و توکّل
چھوٹے نہ کہیں ہاتھ سے دامانِ رضا دیکھ

....

فیض سے تیرے ہی اے قیدِ فرنگ
بال و پر نکلے، قفس کے در کھلے

....

قلزمِ عشق ہیں نفع و سلامت دونوں
اس میں ڈوبے بھی تو کیا، پار اترنا ہے یہی

....

مستحقِ دار کو حکمِ نظر بندی ملا

کیا کہوں کیسے رہائی ہوتے ہوتے رہ گئی

میں نے قصداً کم مثالیں دی ہیں ورنہ مولانا جوہر نے ان میں سے بعض تراکیب کو ایک سے زیادہ مرتبہ بھی استعمال کیا ہے لیکن یہ ضرور ہے کہ انھوں نے ان تراکیب سے اپنے زمانے کے تقاضوں کے مطابق نیا مفہوم لیا ہے۔

مولانا جوہر کی غزلوں کا ایک اور وصف یہ بھی ہے کہ انھوں نے اپنے جذبات اور ذہنی اپج کے اظہار کے لیے عالمِ اسلام کی تاریخ، اسلامی روایات وتعلیمات اور قرآنی آیات اور احادیث سے ماخوذ استعاروں اور تلمیحات کا بھی خوب استعمال کیا ہے جس نے ان کی شاعری کو ایک نیا روپ بخشا ہے۔ مثلاً یہ شعر ملاحظہ ہوں:

طوافِ کعبہ بھی کر آئے شوقِ حور و غلماں میں

جب آخر دار کو دیکھا، درِ باغِ جناں پایا

....

یعقوب پر فضول ہوئے لوگ خندہ زن

یاں لامکاں سے آتی ہے بوئے قبائے دوست

....

یوں بچ سکو مواخذۂ حشر سے تو ہاں

مارا دیارِ غیر میں ہم کو وطن سے دُور

....

یہ بھی کیا پیرویِ حق ہے کہ خاموش ہیں سب

ہاں اناالحق بھی ہو، منصور بھی ہو، دار بھی ہو

....

دشتِ رہِ غربت میں اکیلا تو نہیں تُو!

بطحا کے مہاجر کا تو نقشِ کفِ پا دیکھ

....

کشورِ کفر میں کعبہ کو بھی شامل کر لو

سیرِ ظلمات کو تھوڑی سی فضا اور سہی

....

اللّٰہ کے رستے میں موت آئے مسیحا
اکسیر یہی ایک دوا میرے لیے ہے

علاوہ ازیں مولانا جوہر نے اپنی شاعری میں والہانہ اندازِ بیان اور جذبے کی صداقت کے ساتھ کربلا اور حسینؓ کے استعاروں سے بڑے تواتر کے ساتھ کام لیا ہے۔کربلا ان کے یہاں حق و باطل اور خیر وشر کے درمیان معرکہ آرائی کی علامت ہے جبکہ یزید ظلم وقہر اور حسینؓ نیکی و پارسائی کا پیکر ہے۔ان دو استعاروں، تلازمات اور رعایتِ لفظی کے استعمال نے خاص طور پر ان کی شاعری کو نیا مفہوم اور نئی جہت عطا کردی ہے جو شاید کسی دوسرے شاعر کے یہاں نظر نہیں آتی۔مثلاً یہ شعر دیکھیے جو زبان زدِ خاص وعام ہیں:

بے تاب کر رہی ہے تمنائے کربلا
یاد آ رہا ہے بادیۂ پیمائے کربلا

....

پیغام ملا تھا جو حسینؓ ابنِ علیؓ کو
خوش ہوں وہی پیغامِ قضا میرے لیے ہے
کیا ڈر ہے جو ہو ساری خدائی بھی مخالف
کافی ہے اگر ایک خدا میرے لیے ہے

....

ماتمِ شبیرؓ ہے آمدِ مہدی تلک
قوم ابھی سوگوار دیکھیے کب تک رہے

....

سینچا تھا اس کو اپنے لہو سے حسینؓ نے
اب چاہے اس چمن کو خزاں دے، بہار دے

اور اسی حوالے سے یہ شعر ملاحظہ کیجیے جو نہ صرف واعظوں اور مقرروں کی زبان پر چڑھا ہوا ہے بلکہ ضرب المثل کی حیثیت اختیار کر چکا ہے:

قتلِ حسینؓ اصل میں مرگِ یزید ہے
اسلام زندہ ہوتا ہے ہر کربلا کے بعد

بعض ناقدین کا یہ کہنا بجا ہے کہ مولانا جوہر نے اپنی بعض غزلوں کی زمینیں اور کچھ تراکیب خاص طور پر میر، مومن، غالب، شیفتہ، حالی اور حسرت موہانی سے مستعار لی ہیں اور اس ضمن میں انھوں نے بڑی شد و مد سے مثالیں دی ہیں مگر اردو شاعری میں یہ کوئی نئی بات نہیں۔ مشترک زمینوں اور ترکیبوں سے کلاسیکی شعراء کیا اور جدید شعراء کیا، دیوان کے دیوان بھرے پڑے ہیں مگر دیکھنا یہ ہوتا ہے کہ کسی شاعر نے ان سے روایت سے ہٹ کر اپنے تخیل سے کیا کام لیا ہے۔ہم دیکھتے ہیں کہ مولانا جوہر کے کلام میں متذکرہ شاعروں کے اثرات کے باوجود ملک و ملّت کی فضا کی کارفرمائی ہے اور وہ اپنے مخصوص شعری مزاج اور منفرد رنگ و آہنگ سے الگ پہچانے جاتے ہیں اور ان کی غزلوں میں نئی کیفیت و معنویت کا احساس ہوتا ہے۔اس تمام گفت گو کا حاصل یہ ہے کہ مولانا جوہر ایک مکمل شاعر تھے اور ان کا کلام ان کے جذبات اور ذہنی کیفیات کی

صحیح تصویر پیش کرتا ہے اور یقیناً اس قابل ہے کہ انھیں اردو کے اچھے شاعروں کی صف میں جگہ دی جائے۔

حوالہ جات

۱۔ کلامِ جوہر مرتبہ مولانا عبدالماجد دریابادی مطبع معارف اعظم گڈھ ۱۹۲۵ء

۲۔ دیوانِ جوہر مرتبہ نورالرحمٰن مطبوعہ شیخ غلام علی اینڈ سنز کشمیری بازار لاہور ۱۹۶۲ء

۳۔ محمد علی جوہر، شخص اور شاعر مرتبہ ڈاکٹر آفتاب احمد آفاقی، مطبوعہ ایم آر پبلی کیشنز نئی دہلی ۲۰۰۴ء

4- My Life, A Fragment, Edited and Annotated by: Mushir- ul-Hasan Published by: Manohar Publishers, New Delhi 1999

۵۔ چند ہم عصر از مولوی عبدالحق مطبوعہ اردو اکیڈمی سندھ کراچی ۱۹۹۷ء

۶۔ گنج ہائے گرانمایہ از پروفیسر رشید احمد صدیقی مطبوعہ آئینہ ادب انارکلی لاہور ۱۹۸۶ء

۷۔ مضامینِ محمد علی (حصہ اوّل و دوم) مرتبہ آل احمد سرور مطبوعہ مکتبہ جامعہ دہلی ۱۹۳۸ء

۸۔ مضامینِ محمد علی مرتبہ محمد سرور مطبوعہ اردو اکادمی دہلی ۱۹۳۸ء

۹۔ محمد علی: ذاتی ڈائری کے چند ورق مطبوعہ جامعہ دہلی س۔ن

۱۰۔ شعر الہند (حصہ اوّل) از مولانا عبدالسلام ندوی مطبع معارف اعظم گڈھ ۱۹۳۹ء

۱۱۔ اردو شاعری پر ایک نظر مرتبہ محمد جمیل احمد مطبوعہ غضنفر اکیڈمی کراچی ۱۹۸۵ء

۱۲۔ اردو ادب کی مختصر تاریخ از ڈاکٹر انور سدید مطبوعہ مقتدرہ قومی زبان اسلام آباد ۱۹۹۱ء

۱۳۔ سیرتِ محمد علی (دیباچہ) از رئیس احمد جعفری ندوی مکتبہ جامعہ دہلی ۱۹۳۲ء

۱۴۔ جدید شعرائے اردو مرتبہ مشرف انصاری مطبوعہ فیروز سنز لاہور ۱۹۶۹ء

۱۵۔ انشائے ماجد یا لطائف ادب از مولانا عبدالماجد دریابادی، مطبوعہ ادارہ علم و فن، کراچی ۲۰۰۰ء

۱۶۔ مقدمہ (کلام جوہر) از مولانا عبدالماجد دریابادی انشائے ماجد یا لطائف ادب مطبوعہ ادارہ علم و فن کراچی ۲۰۰۰ء

۱۷۔ پیام، کلکتہ (ماہنامہ) بابت جنوری ۱۹۳۱ء

۱۸۔ آج کل، دہلی (ماہنامہ) مولانا محمد علی جوہر نمبر بابت دسمبر ۱۹۷۸ء

۱۹۔ ہماری زبان، دہلی (ماہنامہ) محمد علی جوہر نمبر بابت جنوری فروری ۱۹۷۹ء

۲۰۔ سچ اعظم گڈھ (ہفتہ وار) بابت ۱۶/جنوری ۱۹۳۱ء

۲۱۔ جامعہ دہلی مولانا محمد علی جوہر نمبر (حصہ اوّل) بابت اپریل ۱۹۷۸ء

۲۲۔ جامعہ دہلی مولانا محمد علی جوہر نمبر (حصہ دوم) بابت جنوری ۱۹۹۰ء